قرآنی نظامِ ربوبیّت

ملکیتِ زمین

فطری قانونِ حقِ ملکیت:

قدرتی اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا فطری طریقہ یہی ہے کہ جس نے اس سے فائدہ اٹھانے میں پہل کر لی وُہ اس کا حقدار سمجھا لیا گیا۔ اس کی مثال یُوں سمجھ لیجئے کہ جنگل میں عموماً درختوں کے پتے، شاخیں اور دیگر لکڑیاں بے کار پڑی رہتی ہیں۔ اب کوئی شخص انہیں اکٹھا کر کے ایندھن کے طور گھر لے آتا ہے یا انہیں منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیتا ہے تو اس کا یہ حق تسلیم کیا جائے گا۔ ایندھن کو اکٹھا کرنے یا اس پر قبضہ کرنے سے پیشتر یہ حق سب انسانوں کے لیے برابر تھا کہ جو کوئی اسے اکٹھا کر کے اس پر اپنا قبضہ جما لے تو یہ اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔

اب اگر ایک شخص ایندھن کو اکٹھا کر دیتا ہے لیکن اسے یونہی جنگل میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کرتا تو پھر بھی اس کا حقِ ملکیت ختم ہو جائے گا۔ اب جو شخص پہلے آ کر اس پر قبضہ جما لے گا وُہ اسی کی ملکیت تصوّر ہو گا۔ لیکن اگر پہلے شخص کا جس نے اکٹھا کرنے کی محنت کی ہے ــــ قبضہ بحال ہو اور کوئی دوسرا شخص یہ جھگڑا ڈال دیتا ہے کہ اس میں سے آدھا مجھے دے دو یا سارا ہی چھین لیتا ہے تو دوسرا شخص غاصب متصوّر ہو گا جس نے پہلے شخص کے حقِ ملکیت کو چھیننے یا اس میں جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یا اگر پہلے شخص نے یہ ایندھن اکٹھا کر کے اپنے گھر میں محفوظ کر لیا ہے اور کوئی دوسرا شخص پہلے شخص سے آنکھ بچا کر اس کا محفوظ کیا ہُوا ایندھن اٹھا لے جاتا ہے تو وُہ چور سمجھا جائے گا۔

حقِ ملکیت کے عوامل:

گویا دو چیزیں کسی انسان کے حق ملکیت کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ابتدائی محنت اور اس پر قبضہ اور حفاظت۔

اب دیکھیے کسی شخص کو ایسی چیز کہیں گری پڑی مل گئی ہے یا اسے خود اٹھا کر اس نے محفوظ کر لیا ہے جس سے وہ تو فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور وہ اس کے لیے بیکار ہے اور ایک مدت تک یونہی پڑی رہتی ہے لیکن کوئی دوسرا شخص اس چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو اس پہلے شخص کو چاہیے کہ وہ چیز اس شخص کو از راہِ احسان دے دے جو اس کو سمیٹتا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے کیونکہ کسی بھی چیز کی اصل غرض و غایت اس چیز سے انتفاع یا فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اب اگر پہلا شخص وہ چیز از خود دوسرے کے حوالے نہیں کرتا تو دوسرے لوگ اسے ایسا کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کسی چیز پر ابتدائی محنت اور قبضہ جمانے کے باوجود کوئی شخص اس سے انتفاع کی اہلیت نہیں رکھتا تو یہ عدم انتفاع اس کے حق ملکیت کے ساقط کرنے کا باعث بن سکتا ہے گویا ابتدائی محنت اور قبضہ تو ملکیت کے لیے حق بیں مفید ہیں۔ انتفاع اس حق کو مضبوط بناتا ہے اور عدمِ انتفاع اس حق کو کمزور کر دیتا ہے۔

ایسے ہی حق ملکیت سے متعلق پیدا ہونے والے جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے حکومتیں قانون بناتی ہیں۔ زمین بھی چونکہ ایک قدرتی عطیہ ہے لہٰذا اس سے انتفاع کے لیے بھی یہی قدرتی اصول لاگو ہوتے ہیں۔ حکومت کا کام یہ ہونا چاہیے کہ:

۱۔ جو شخص جتنی زمین کو زیرِ کاشت لا کر اس سے فائدہ حاصل کر رہا ہے وہ اس کے قبضہ میں رہنے دے۔

۲۔ جس شخص نے کسی قطعہ زمین پر قبضہ جما رکھا ہے لیکن وہ اس کو زیرِ کاشت نہیں لاتا یا بالفاظِ دیگر اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ حکومت اس سے زمین واپس لے کر کسی ایسے شخص کو دے دے جو اسے زیرِ کاشت لانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

۳۔ حکومت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ بے کار پڑی ہوئی زمین سے کچھ حصہ کسی ایسے شخص کو عطا کر دے جو اسے زیرِ کاشت لا کر فائدہ اٹھا سکے اور حکومت کا یہ عطیہ بھی دو اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔

ا۔ محض زمین سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے کسی کاشتکار کو دے دی جائے۔
ب۔ کسی شخص کو محض حکومت کی خدمات کے صلہ میں عطا کر دی جائے تاکہ وہ اسے زیر کاشت لاکر اس سے فائدہ حاصل کرے۔

انسان کی ابتدائی زندگی سے لے کر موجودہ دور تک زمین کی ملکیت سے متعلق یہی اصول لاگو رہے ہیں کسی مملکت کے قبضہ میں جتنی زمین ہوتی ہے اس پر ابتدائی حق تو حکومت ہی کا سمجھا جاتا رہا ہے بعد میں حکومت انہی مندرجہ بالا اصولوں کے تحت زمین کے حق ملکیت کے فیصلے کرتی ہے۔

حق ملکیت کا اسلامی تصور

اسلام نے آکر یہ تصور پیش کیا کہ ہر چیز کا خالق مالک اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا یہ کائنات بشمول زمین سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے، ارشادِ باری ہے:

"وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱۰)

"اور زمین اور آسمانوں کی وراثت خدا ہی کے لیے ہے"۔

تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ اگر ایک مالک زمین زمین بیچ دیتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اگر مر جاتا ہے تو اولاد اس کی زمین کی وارث بن جاتی ہے ان میں سے کوئی ایسا مالک نہیں جو فانی نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جسے بقائے دوام ہے لہٰذا وہی زمین و آسمان کا خالق و مالک بھی ہے اور وارث بھی۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ہی نوعِ انسان کا مستقر اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بنائی ہے لہٰذا اسلام نے زمین پر انسانوں کا حق بھی تسلیم کیا ہے۔ اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی۔ زمین پر اجتماعی حق ملکیت یا حکومت کے حق کے لیے درج ذیل آیت ملاحظہ فرمائیے:

"ان الارض یرثہا من عبادی الصالحون" (۲۱/۱۰۵)

"بے شک میرے نیکو کار بندے زمین کے وارث ہوں گے"۔

اور انفرادی ملکیت کے لیے درج ذیل آیت ملاحظہ فرمائیے!

"ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ (۷/۱۲۸)

"بے شک زمین اللہ کی ہے اور اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے

اس کا مالک بنا دیتا ہے!"

گویا وُہ تصورِ ملکیتِ زمین جو ابتداء سے چلا آرہا تھا اس میں صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ زمین کا اصل مالک و وارث اللہ تعالیٰ ہے۔ تمہاری محنت کو بارآور بھی وہی کرتا ہے لہٰذا انسانوں کو چاہیے کہ زمین اور اس سے پیدا شدہ کھیتی کو خدا ہی کے احکام کے مطابق استعمال کیا جائے یعنی پیدا شدہ کھیتی سے اللہ کا حق بھی ادا کیا جائے اور کسی دوسرے کی زمین کو ناجائز طور غصب بھی نہ کیا جائے۔ رہا زمین پر انفرادی یا اجتماعی حقِ ملکیت تو اسے اسلام نے جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔

یہ تو تھا حقِ ملکیت کے متعلق وُہ تصوّر جو قرآن سے حاصل ہوتا ہے اور جس کی تائید و توثیق احادیث اور تاریخ سے بھی ہوتی ہے مگر جب سے رُوس میں اشتراکی نظام قائم ہُوا ہے اور اس نے دوسرے ملکوں میں اس نظام کے بپا کرنے کے لیے فضا کو سازگار بنانے کے لیے اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے ہیں نو اشتراکیت نوازوں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ اشتراکی نظام زمین اور اسی طرح دوسری اشیاء پر انفرادی حقِ ملکیت تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا ان حضرات نے قرآن سے حقِ ملکیت زمین کے عدم جواز کا کھوج لگانا شروع کر دیا۔ یہ مسئلہ کوئی ایسا تو ہے نہیں جو انسانی زندگی کے کسی تاریک گوشہ سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ مسئلہ انسان کی معاش سے تعلق رکھتا اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو زمین کی ذاتی ملکیت کو ناجائز یا حرام قرار دینا مقصود ہوتا تو قرآن میں ایسے واضح احکام نازل کیے جاتے جن سے سابقہ مروّجہ حقِ ملکیت کی تردید کی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قرآن میں کوئی ایسا واضح حکم موجود نہیں۔ قرآن نے بے شمار مروجہ عادات و رسوم کی واضح الفاظ میں تردید بھی کی ہے، حرام بھی کیا ہے اور اصلاح بھی فرمائی ہے جیسے شراب، سود، تعدّدِ ازواج، میراث، طلاق اور ایلاء وغیرہ۔ لیکن ذاتی حقِ ملکیت کے متعلق تردید تو درکنار اس کی توثیق ضرور فرمائی ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب کسی باطل نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنے کی ضرورت درپیش ہو تو واضح احکامات کو چھوڑ کر متشابہ آیات کو اپنی خواہشات و نظریات کا ہدف بنایا جاتا ہے اور اسی بات سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، ارشادِ باری ہے:

هو الذی انزل علیك الكتاب منه ایات محكمات هن

ام الکتاب واخر متشابہات، فاما الذین فی قلوبہم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم[۳]

"وہی اللہ ہی تو ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم[۱] ہیں اور (وہی) اصل کتاب ہیں۔ اور بعض متشابہ[۲] ہیں تو جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور اس کی تاویل کریں حالانکہ ان کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے اور (یا پھر وہ لوگ) جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ متشابہات سے استنباط کرنا اور محکمات کو نظر انداز کرنا ان لوگوں کا کام ہے جن لوگوں کے دل میں ٹیڑھ ہو۔ بالفاظ دیگر یہ لوگ کوئی باطل نظریہ قرآن سے کشید کرنا چاہتے ہوں۔

۲۔ اس طرح کی تاویل کا حق صرف ایسے لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی دینی علوم اور ان پر عمل ہو۔

اس واضح حکم کے باوجود ان دوستوں نے متشابہات ہی کو اپنی تاویل کا نشانہ بنایا ہے اب جن آیات یا واقعات سے عدم جواز حق ذاتی ملکیتِ زمین ثابت کیا جاتا ہے ہم اس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

عدم جواز حقِ ملکیتِ زمین

۱۔ قرآنی آیات سے:

جن قرآنی آیات سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاتا ہے، ان میں سرفہرست تو اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ یا للہ میراث السمٰوٰت والارض ہی ہیں جنھیں ہم "حق ملکیت کا اسلامی تصور"

---

[۱] محکمات وہ آیات ہیں جن کے معنی ایک ہی ہوں اور صاف اور واضح ہوں اور متشابہات وہ آیتیں ہیں جن میں کئی معنوں کا احتمال پایا جاتا ہو اور مطلب کے کئی پہلو ہوں حقیقت میں مراد تو ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ مگر الفاظ اور ان کی ترکیب ایسی ہوتی ہے کہ دوسرے معنوں کا بھی احتمال پایا جاتا ہے۔ ایسی آیتوں کے معنی اپنی رائے سے نہ کرنے چاہئیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے رسول اللہ اور ان کے اصحاب نے کیا سمجھا۔ اس معیار کو نظر انداز کر کے اگر اپنی رائے سے تاویل کی جائے تو اس کے لیے وعید شدید آئی ہے کیونکہ یہی بالتفسیر بالرائے گمراہی کا اصل سبب ہے۔

کے ذیلی عنوان کے تحت پیش کر چکے ہیں، لہٰذا ان پر اب مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

تیسری آیت جو اس سلسلہ میں بڑی شدّ ومدّ سے پیش کی جاتی ہے، وُہ یہ ہے:

"وجعل فیھا رواسی وبارک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواء للسائلین!" (۴۱/۱۰)

"اور اسی نے زمین میں اس کے اُوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامانِ معیشت مقرر کیا۔ چار دن (periods) میں اور تمام طلبگاروں کے لیے یکساں!"

آیتِ بالا میں دو الفاظ سواء اور سائلین ذو معنی ہیں۔ اسی وجہ سے آیت کے ترجمے مختلف حضرات نے مختلف کیے ہیں۔ تاہم ہم نے وہی معنی درج کیے ہیں جو ہمارے ان دوستوں کے حسبِ پسند ہیں۔

لفظ سئل کے معانی:

سئل کا لفظ پوچھنا اور مانگنا دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً:

۱۔ بمعنی پوچھنا جیسے فرمایا:

"سألھم خزنتھا الم یاتکم نذیر" (۶۷/۸) "دوزخ کے داروغہ ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا؟"

۲۔ بمعنی مانگنا جیسے فرمایا:

"لا یسئلون الناس الحافا" (۲/۲۷۳) "وُہ لوگوں سے چمٹ کر نہیں مانگتے!"

سئل کا لفظ قرآن کریم میں ۷۰ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ ۶۵ مقامات پر پوچھنے کے معنوں میں آیا ہے اور ۵ مقامات پر مانگنے کے معنوں میں۔

لفظ سواء کے معانی: اسی طرح سواء کا لفظ بھی بنیادی طور پر دو معنی کا حامل ہے (۱) استقامت اور (۲) دو چیزوں کے درمیان برابری اور اعتدال (مقائیس اللغۃ لابن الفارس) اور قرآن میں یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً

۱۔ استقامت کے لیے "واھدنا الی سواء الصراط" (۳۸/۲۲) "اور ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دیجئے"۔ یہاں سواء کا لفظ مستقیم کے معنوں میں آیا ہے جیسے سورۃ فاتحہ میں فرمایا "اھدنا الصراط المستقیم (۱/۵)" "ہم کو سیدھی راہ پر چلا"،

۲۔ برابری اور اعتدال کیلیے جیسے فرمایا "سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم (۲/۶)" آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے برابر ہے۔

"خذوہ فاعتلوہ الی سواء الجحیم (۴۴/۴۷)" "فرشتوں کو حکم دیا جائیگا کہ اس گنہگار کو پکڑ لو اور کھینچتے ہوئے اسے دوزخ

کے بیچوں بیچ لے جاؤ!"

اب دیکھیے سَوَاۤءً لِّلسَّاۤئِلِیۡنَ" کے مندرجہ ذیل معنی ہمیں تراجم میں ملتے ہیں:

(۱) "برابر ہے واسطے پوچھنے والوں کے" (شاہ رفیع الدین)

(۲) سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب اور حاجت کے مطابق (تفہیم القرآن مودودی صاحب)

(۳) ٹھیک جواب پوچھنے والوں کو (احمد رضا خاں)

(۴) تمام ضرورتمندوں کے لیے یکساں طور پر (پرویز صاحب - قرآنی نظام ربوبیت)

اور یہ اختلاف معانی متاخرین تک ہی محدود نہیں متقدمین میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ قتادہ اور سدّی کا یہ معنی بیان کرتے ہیں "پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا" اور ابن زید اس کا یہ معنی بتلاتے ہیں "ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق" بحوالہ تفہیم القرآن حاشیہ آیت مذکورہ)

برابری کس کس کی اور کس بات میں؟

اب ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ صرف پرویز صاحب کا ترجمہ ہی صحیح ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت مند، طلبگار یا حاجتمند صرف انسان ہی نہیں دوسری مخلوقات مثلاً حیوانات، چرند، پرند، کیڑے، مکوڑے سب ہی خوراک کے محتاج ہیں اور سب کے لیے یہ خوراک زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت:

"والارض وضعہا للانام" (۵۵/۱۰)

"اور زمین کو مخلوقات کے لیے بچھایا"

سے بھی واضح ہے۔ تو کیا یہ ساری مخلوق زمین یا پیداوار زمین میں برابر برابر کی حصہ دار ہوگی۔ جیسا کہ ہمارے یہ دوست کہتے ہیں؟ آخر انفرادی ملکیت سے زمین نکال کر اس کی پیداوار کو صرف انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تو دوسری مخلوق کو سواء للسائلین کے زمرہ سے نکالنے کی کیا دلیل ہے؟

اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین سب مخلوقات میں برابر برابر تقسیم ہو یا اسکی پیداوار؟ اور کیا یہ ممکن بھی ہے، واضح سی بات ہے کہ اس زمین کی پیداوار سے انتفاع میں تو سب مخلوقات ایک جیسا حق رکھتی ہے جیسا کہ ابتدا میں ایندھن کی مثال سے واضح کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو زمین کو زیر کاشت لاکر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کے فائدہ اٹھاتے برابر ہے تو اس برابری کا مطلب صرف یہ ہوا کہ بے کار زمین کو زیر کاشت لانے کا

ہر شخص کو ایک جیسا حق حاصل ہے۔ اس میں کسی خاص گروہ یا نسل یا خاندان کا کوئی امتیاز نہیں بس یہی اس آیت کا مطلب ہے اگر حکومت زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لے تو یہ سواء للسائلین کیسے ہوئی؟ پھر اگر حکومت اس کی پیداوار کو اپنی مرضی سے افراد کو دیتی یا ان میں تقسیم کرتی ہے تو بھی عملی طور پر سواء للسائلین کے تقاضے پورے کرنا ناممکن ہے۔

سیاق وسباق کا طریق:

کسی آیت کے مخصوص معانی متعین کرنے کا پہلا طریقہ تو تعریفِ آیات ہے۔ تعریفِ آیات سے جو نتیجہ نکلا وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ آیت زیرِ غور کو سیاق وسباق کے اندر رکھ کر معلوم کیا جائے کہ یہاں کون سے معنی فٹ بیٹھتے ہیں۔ آیتِ محولہ بالا سورہ حم السجدہ کی دسویں آیت ہے۔ اب اس سورہ کی آیات ۸ تا ۱۲ ملاحظہ فرمائیے:

"قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ اندادا ذٰلک رب العلمین۔ وجعل فیہا رواسی من فوقہا وبارک فیہا وقدر فیہا اقواتہا فی اربعۃ ایام سواء للسائلین۔ ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لہا وللارض ائتیا طوعا اوکرہا قالتا اتینا طائعین فقضٰہن سبع سمٰوٰت فی یومین واوحی فی کل سماء امرہا وزینا السماء الدنیا بمصابیح وحفظا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم" (۴۱/۸-۱۲)

"کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا، اور دوسروں کو) اس کا مدِ مقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہانوں کا مالک ہے اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سامانِ معیشت مقرر کیا (سب) چار دن میں (اور تمام) طلبگاروں کے لیے یکساں۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو خدا نے اس (آسمان) اور زمین سے فرمایا، کہ تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے انہوں نے کہا ہم خوشی سے آئے۔ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور

ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں یعنی ستاروں سے مزین کیا اور (شیطانوں سے) محفوظ رکھا۔ یہ زبردست اور خبردار کے مقرر کیے ہوئے اندازے ہیں"۔

ہم اس کتاب کے آغاز میں بتلا چکے ہیں کہ انسانی تاریخ کا ایک بنیادی اور اہم سوال یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کیونکر ہوئی؟ تو ان آیات میں اسی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے جو سائلین کے اطمینان کے لیے کافی ہے اب ان آیات میں سے "سواءً للسائلین" والی آیت نکال کر اسے مخصوص معنیٰ میں محصور کر کے اس سے انفرادی ملکیت زمین کا عدم جواز ثابت کرنا ہمارے خیال میں قرآنِ کریم کے انداز کا منشا پورا نہیں کرتا اور جن علماء نے سواء للسائلین کا ترجمہ "برابر ہے طلبگاروں کے لیے" کیا ہے، وہ بھی اس سے وہ مفہوم مراد نہیں لیتے جو ہمارے اشتراکیت پسند حضرات متعین کرتے ہیں۔

چوتھی آیت جس سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاتا ہے درج ذیل ہے:

"وجعلنا لکم فیہا معایش ومن لستم لہ برازقین!" (۱۵/۲۰)

(۱) "اور ہم نے اس (زمین) میں تمہارے اور جن کے تم رازق نہیں ہو گزارے کے اسباب پیدا کیے ہیں" (ثناء اللہ امرتسری)

(۲) اور ہم نے معیشت کے اسباب فراہم کیے تمہارے لیے بھی اور ان بہت سی مخلوقات کے لیے جن کے تم رازق نہیں ہو۔ (تفہیم القرآن)

گویا اس آیت میں بھی "من لستم لہ برازقین" سے مراد وہ انسان مراد نہیں "جن کے پاس اپنی زمین نہیں"، بلکہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات مراد ہے۔ البتہ شبیر احمد عثمانی نے اس کا ترجمہ "جنھیں تم روزی نہیں دیتے" کر کے حاشیہ پر "باندی غلام، چوپائے اور خدام وغیرہ لکھا ہے۔

اب اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہاں من لستم لہ برازقین سے مراد صرف انسانوں کا نادار طبقہ ہی ہے جو زمین کا مالک نہیں تو بھی اس سے ملکیتِ زمین کا عدم جواز کب ثابت ہوتا ہے؟ یہاں تو ایک اصول بیان کیا جا رہا ہے کہ "ہم نے سب کے لیے زمین میں سامانِ معیشت بنا دیا ہے"، زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ امراء کو چاہیے کہ ناداروں کی ضروریات بھی پوری کریں اور یہ بات اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے

اس سے کسی کو انکار نہیں۔

اس کے برعکس قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے انفرادی ملکیت زمین کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"ایود احدکم ان تکون له جنة من نخیل و اعناب تجری من تحتها الانهٰر له فیها من کل الثمرات و اصابه الکبر وله ذریة ضعفاء فاصابها اعصار فیه نار فاحترقت" (۲/۲۶۶)

"بھلا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور اس میں اس کے لیے ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور اُسے بڑھاپا آ پکڑے اور اس کے ننھے ننھے بچے ہوں تو (نا گہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہُوا بگولا چلے وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔"

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

واضرب لهم مثلا رجلین جعلنا لاحدهما جنتین من اعناب و حففنٰهما بنخل وجعلنا بینهما زرعا" (۱۸/۳۲)

"اور ان سے دو شخصوں کا حال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ عنایت کیے تھے اور ان کے گرداگرد کھجوروں کے درخت لگا دیے تھے اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔"

ان تصریحات سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ملکیتِ زمین سے متعلق جو تصور پہلے سے چلا آرہا تھا قرآن کریم نے اسے بدستور برقرار رکھا ہے۔ اگر ملکیتِ زمین کے مسئلہ میں ترمیم کرنا مقصود ہوتا تو اس کے لیے واضح اور قطعی احکامِ امتناع کا نازل ہونا ضروری تھا۔ جیساکہ شراب، ترکہ، سود، پردہ، کثرتِ ازدواج اور طلاق وغیرہ کے متعلق نازل ہوئے ہیں، بلکہ یہ مسئلہ تو اور بھی زیادہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔

۲۔ تاریخ سے:

قرآن کے بعد ان حضرات نے احادیث اور تاریخ سے بھی استشہاد کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس واقعہ کی حقیقت کچھ اس طرح ہے:

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب عراق و ایران کا بہت سا علاقہ فتح ہوا تو خمس بیت المال کے لیے اور باقی اموالِ غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ حضرت عمرؓ اپنی صوابدید کی بنا پر یہ چاہتے تھے کہ اموالِ منقولہ کو تو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے لیکن مقبوضہ زمینوں کو بیت المال کی تحویل میں دے دیا جائے۔ آپؓ کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل امور تھے:

۱۔ اگر مجاہدین میں یہ زمینیں تقسیم کر دی گئیں تو مجاہدین زراعت کی طرف متوجہ ہو جائینگے اور عسکری قوت میں کمی ہو جائے گی۔

۲۔ ایک وسیع علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگین آچکا ہے۔ اس کی سرحدوں کی حفاظت پر بے شمار اخراجات کی ضرورت ہے۔ اگر یہ زمینیں بھی مجاہدین میں بانٹ دی جائیں تو اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟

۳۔ آپ مملکتِ اسلامیہ کو ایک فلاحی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق "اگر مجھے پچھلے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں جو بستی فتح کرتا اسے فتح کرنے والوں میں بانٹ دیتا، جیسے آں حضرتؐ نے خیبر کو بانٹ دیا تھا" (کتاب المزارعۃ۔ باب اوقاف اصحاب النبی وارض الخراج)

چنانچہ اس مسئلہ پر شدید اختلاف واقع ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت بلالؓ اور تمام فوجی حضرات اس حق میں تھے کہ یہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم ہونا چاہئیں۔ جیسا کہ فتح خیبر کے وقت حضور اکرمؐ نے تقسیم فرمائی تھیں، تاہم بہت سے صحابہ حضرت عمرؓ کے ہم خیال بھی تھے اور حضرت بلالؓ نے آپ کو اس سلسلہ میں اتنا پریشان کیا تھا کہ حضرت عمرؓ دعا کرتے تھے:

"اللھم اکفنی بلالا"

"اے اللہ! مجھے بلالؓ سے نجات دے" (کتاب الخراج، امام ابو یوسف)

آپ نے اس سلسلہ میں کئی بار اہل شوریٰ اور اکابر صحابہؓ کی مجالسِ مشاورت بھی بلائیں لیکن معاملہ طے ہونے میں نہ آتا تھا اور آپ اس سلسلہ میں بہت پریشان رہتے تھے۔ تائید ایزدی سے آپ کو اموالِ غنیمت سے متعلق ایک آیت کا ٹکڑا یاد آگیا جو کہ اس معاملہ میں نصِ قطعی کا درجہ رکھتا تھا اور جس کی وسعت کے اس گوشہ کی طرف، پہلے کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔ آیت کے ٹکڑا کے الفاظ یہ تھے: "والذین جاء وا من بعدھم" (یعنی اموالِ غنیمت میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں) چنانچہ حضرت عمرؓ نے

ایک اجلاس عام بلایا اور اس معاملہ کے متعلق اس آیت سے استدلال پیش کیا تو عامۃ الناس آپ کے ہمنوا ہو گئے۔ چنانچہ ان نئی مفتوحہ زمینوں کو بیت المال کی ملکیت قرار دیا گیا۔

اب دیکھیے اس واقعہ سے بھی فقط اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ نئی مفتوحہ زمینیں تو قومی ملکیت میں لے لی گئیں اور سابقہ زمینیں جو پہلے مالکوں کے قبضہ میں تھیں وہ ان کے پاس رہیں۔ گویا اس واقعہ سے بھی زمین کی انفرادی ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے، نہ کہ عدم جواز کسی مالک کی زمین حکومت کو غصب کرنے کا ہرگز اختیار نہیں۔

۲۔ آج بھی اگر ایسے حالات پیش آجائیں تو اسلامی مملکت کے سربراہ کو ایسا کرنے کا اختیار ہے کہ وہ نئی مفتوحہ زمینوں کو سرکاری زمین قرار دے جیسا کہ آج کل بھی یہی دستور ہے۔

۳۔ جو فیصلہ بھی کیا جائے اس کی دلیل قرآن سے پیش کرنا اور اس کے متعلق مشورہ کرنا بھی ضروری ہے۔

اس ایک واقعہ کے بغیر ان حضرات کو ملتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ سے کوئی مثال ایسی نہیں مل سکی جس سے یہ حضرات کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ البتہ ایسے واقعات سے پوری تاریخ بھری پڑی ہے جن سے حقِ ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ بائیبل سے:

قومی ملکیت کے جواز پر قلم اٹھاتے ہوئے (کسی صاحب کے استفسار پر) پرویز صاحب نے بائیبل سے انتظام یوسفی کو بھی تائید کے طور پر پیش کیا ہے۔ گو اسنادی معیار کے لحاظ سے بائیبل کا مقام حدیث سے بہت پست ہے اور قرآن نے اسے تحریف شدہ بھی قرار دیا ہے تاہم جہاں سے قومی ملکیت کی تائید میں کچھ مل جائے وہی غنیمت ہے۔ آپ پہلے بائیبل کی عبارت نقل فرماتے ہیں پھر اس پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔

انتظام یوسفی:

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لیے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی سرزمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ یوسف نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی۔ اس غلہ کے بدلہ میں جو لوگوں نے مول لیا جمع کی اور یوسف اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسف سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے

کیوں دیں؟ کیونکہ نقدی چک گئی۔ یوسف نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں دوں گا، وہ اپنے چوپائے یوسف کے پاس لائے اور یوسف نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انھیں اس سال پالا جب وہ سال گزر گیا وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپایوں کے گلے بھی لے لیے سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بندوں اور زمینوں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے ہلاک کیوں ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسف نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو بہت تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسف نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لیے ہے۔ کھیت میں بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں، ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین بنایا جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

بائیبل کتاب پیدائش باب ۴۷ سے یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اقتباسِ بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علتِ مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین بڑے بڑے

زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے جس سے وُہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں، اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر قومی ملکیت میں آگئی۔ اس کے بعد حضرت یوسف نے اس زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچائیں تاکہ وُہ خود کاشت کر سکیں۔ یہ کاشتکار اپنی محنت کے ماحصل کے مالک آپ تھے۔ صرف پیدائش کا پانچواں حصّہ حکومت کو دینا پڑتا تھا تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشتکار کی محنت میں شریک نہیں تھے، اس طرح حضرت یوسف نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں۔"

(قرآنی فیصلے ص ۳۶۰ تا ۳۶۲)

گو آپ نے یہ اقتباس نقل کرنے میں بھی حک و اضافہ سے کام لیا ہے، تاہم اسے سر دست ہم نظر انداز کر رہے ہیں، البتہ یہ بات ضرور کہیں گے کہ اس سے اگلی آیت آپ نے درج نہیں فرمائی جو اس طرح ہے:

"اور اسرائیلی ملک مصر میں جن کے علاقہ میں رہتے تھے اور انھوں نے اپنی جائدادیں کھڑی کر دیں اور وُہ بڑھے اور بہت زیادہ ہو گئے۔"

(بائیبل کتاب پیدائش، باب ۴۷، آیت نمبر ۲۷)

یہ آیت غالباً آپ اس لیے چھوڑ گئے کہ اس سے انفرادی ملکیت کا ثبوت ملتا تھا۔

اب ہم ان نتائج پر نظر کریں گے جو آپ نے بائیبل کی آیات سے اخذ کیے ہیں:

۱۔ آپ کے خیال میں ملکِ مصر میں قحط کا سبب زمین پر زمینداروں کی ملکیت تھی جبکہ قرآنِ کریم میں فرعونِ مصر کا خواب کہ "سات موٹی گائیں سات دبلی گایوں کو کھا گئیں" کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے یہ بتلائی تھی کہ پہلے سات سال رزق کی خوب فراوانی ہو گی۔ بعد میں سات سال سخت قحط نمودار ہو گا۔ اب اگر قحط کا سبب زمینداری اور قحط کو دُور کرنے کے لیے زمینوں کو قومی ملکیت میں لینا ہی اس کا علاج ہے، تو آیا فراوانی کے سات سالوں میں یہ زمینیں قومی ملکیت میں تھیں؟ یہ تو ہوتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں کاشتکار پر زیادتی ہوتی ہے، لیکن کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں ملک میں قحط پڑ جاتا ہے؟

۲۔ صحیح معنوں میں بڑے زمیندار یا جاگیردار تو کاہن لوگ تھے، ان کی زمین ان کے پاس ہی رہنے دی گئی تو کیا یہ علاج صرف چھوٹے زمینداروں کے لیے ہی تھا۔

۳۔ زمینداروں سے بھی حضرت یوسفؑ نے زمین خریدی تھی اور اس کے عوض انہیں اتنی مالیت کا غلہ دیا تھا لیکن اشتراکیت میں تو زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی جاتی ہیں، اس کا کیا جواز ہے؟

۴۔ حضرت یوسفؑ نے زمینوں کو قومی تحویل میں لینے کے بعد بھی پانچواں حصہ حکومت کے لیے مقرر کر کے بٹائی کا جواز تو ثابت کر دیا حصہ ملکیت کا زیادہ ہو یا کم محنت کا اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اشتراکیت میں پیداوار کے ماحصل کا مالک کاشتکار نہیں ہوتا بلکہ حکومت ہوتی ہے، اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اشتراکیت جاگیرداری اور سرمایہ داری کی بدترین شکل ہے۔ اس میں حکومت کاشتکاروں سے وہی سلوک کرتی ہے جو انفرادی طور پر ایک زمیندار یا جاگیردار کاشت کاروں سے کرتا ہے۔

۵۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ جن لوگوں سے حضرت یوسفؑ نے زمین لی تھی وہ کاشتکار نہ تھے بلکہ زمیندار تھے؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایک زمیندار خود اپنی زمین کاشت کرتا ہو اور آپ کی تعبیر کے مطابق کاشتکار تو دبلی گائے ہی ہو سکتا ہے پھر انہیں کیوں ذبح کیا گیا؟

۶۔ آپ کے خیال میں موٹی گایوں سے مراد زمیندار اور دبلی گایوں سے مراد کاشتکار ہیں۔ قرآن ان دونوں کی تعداد سات سات بتلاتا ہے تو کیا زمین کی ملکیت میں کل سات ہی زمیندار تھے اور سات ہی کاشتکار تھے؟

سو یہ ہیں وہ دلائل جنھیں ان حضرات نے بسعی بسیار اکٹھا کیا ہے۔ ان دلائل میں جو قوت یا وزن ہے وہ آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ضرورتِ رشتہ اہلحدیث خاندان کے ایک نوجوان کے لیے موزوں رشتہ کی ضرورت ہے۔ لڑکا تعلیمیافتہ خوش اخلاق اور صاحب کارخانہ و جائیداد ہے۔ جہیز اور ذات کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ۴۷ معرفت ماہنامہ ترجمان الحدیث ۴۷۵ شادمان کالونی لاہور